ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

استعماری گٹھ جوڑ اور ''فن برائے فن'' والے ایک نقاد کی سماجی حسیت

Muhammad Hassan Askari began his writing career as a short story writer. Then he began writing criticism. He was against Progressive Writers Movement since the very beginning. He was in favor of the significance of life and ideology in literature. However, he was not in favor of literature being dominated by ideologies. Due to this, Askari was declared as an escapist by the progressive writers. The truth, I argue, is that Askari was an advocate of the concept of inseparable relation between art and life. Throughout his life, he has been writing on the issues of modern life: culture, politics, imperialism, etc. In this paper I have focused on Askari's letters and various other works and showed that although he was in favour of a peculiar kind of the theory of art for art sake, but he was advocate of inseparable relation of life was literature.

محمد حسن عسکری کا نام بعد میں اگرچہ کلچر، تہذیب، ادب اور تنقید کے ساتھ جڑ کر رہ گیا مگر شروع میں ان کی دلچسپی فلسفہ اور سیاست کی طرف تھی۔ شفیع عقیل کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ میں ادبی تحریک کا سبب کیا تھا، عسکری کا جواب تھا کہ پہلے ان کا رجحان فلسفے کی طرف زیادہ تھا۔ ''جب میں بی اے میں پڑھتا تھا تو مجھے ادب سے کوئی خصوصی دلچسپی نہیں تھی بلکہ افلاطون اور ارسطو سے شغف زیادہ تھا۔''[1] اور ان کی سیاست سے دلچسپی کی بات تو پورے ایک الگ مقالے کی متقاضی ہے۔ مگر ادب کو وہ ہمیشہ سیاست گردی سے دور رکھنے کے قائل تھے۔ ان کا ساری زندگی ترقی پسندوں سے شدید جھگڑا رہا۔ ترقی پسند، ادب میں زندگی اور ایک مخصوص طرح کی سیاست کی کارفرمائی کے زبردست مبلغ تھے اور اس لئے حقیقت پسند اور اشتراکی حقیقت نگار کہلاتے تھے۔ اس کے برعکس عسکری کو 'ادب برائے ادب' کا حامی اور محض تاثرات پیش کرنے والا نقاد کہا جاتا رہا ہے۔ حال آنکہ اپنے معروف سلسلہء مضامین ''جھلکیاں'' کے روزِ آغاز (جنوری ۱۹۴۴ء) ہی میں انہوں نے اپنا ادبی مسلک لکھ دیا تھا کہ:

> ''میری طرف سے، مجھے اندیشہ ہے، یہ شبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ میں آرٹ کو زندگی سے الگ سمجھتا ہوں۔ لیکن آرٹ اور زندگی کا تعلق تو اتنی ابتدائی اور بنیادی ---اس لئے مبتدیانہ--- چیز ہے کہ بار بار اسے دہراتے رہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ صفحے صرف لفظوں کی تراش خراش اور نوک پلک تک محدود نہیں رہ سکتے۔ زندگی ان میں دروازے توڑ توڑ کر گھستی رہے گی۔ تاہم یہ کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا کہ مادہ آرٹ کے لئے ضروری سہی لیکن اس پر آرٹ کا

عمل ہو چکنے کے بعد وہ مادہ نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔مادی چیزوں سے شاعر ایسی شکلیں بنا سکتا ہے جو انسان سے بھی زیادہ حقیقی ہیں''۔[۲]

فن برائے فن کے حوالے سے انہوں نے لکھا تھا کہ''ایک زمانے میں یار لوگوں نے فن برائے فن کا نعرہ میرے نام کے ساتھ چپکا دیا تھا، کیونکہ میں اپنے اکثر مضامین میں اس فقرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا''۔[۳] یوں تو عسکری نے پچاسیوں جگہ زندگی اور ادب کے ناقابل علیحدگی تصور پر گفتگو کی ہے۔مگر سر دست ان کے بارے میں ادب برائے ادب کے نظریئے کا حامی نہ ہونے کو حتمی طور پر رد کرنے کیلئے یہی بیان کافی ہے۔ہاں وہ ادب اور آرٹ میں زندگی کی کارفرمائی کو ترقی پسندوں کی طرح یقیناً نہیں دیکھتے تھے:''آرٹ میں کوئی چیز ویسی نہیں رہتی جیسی وہ زندگی میں ہے۔آرٹ اس کی ماہیت تبدیل کر دیتا ہے''[۴] اس لئے عسکری کے ادب اور سیاست سے شغف پر بات کرتے ہوئے ان دونوں کے حدود کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے جو انہوں نے قائم کئے تھے۔انہیں سیاست سے نہ صرف نظری بلکہ تحریک پاکستان اور اس دور کی مسلم لیگی سیاست سے خصوصی اور عملی دلچسپی رہی ہے۔ ۹/اگست ۱۹۴۵ کے ایک خط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد میں لکھتے ہیں:

''آج کل مجھے مسلم لیگ کا جنون ہو رہا ہے اس وجہ سے اور میرا جی چاہتا ہے کہ کالج (عربک کالج، دہلی) ہی میں رہوں تاکہ دسہرے کی لمبی چوڑی چھٹیوں میں دو چار قصبوں اور گاؤں میں جا کر کچھ سیاسی کام کر سکوں۔جب میں انٹر میں تھا تو اس زمانے میں تو ایک قصبے میں مَیں نے مسلم لیگ کی تنظیم کی تھی،لیکن پھر میں سیاست سے دور ہٹتا چلا گیا۔لیکن اب کچھ نہ کچھ سیاسی کام ضروری معلوم ہوتا ہے۔بلکہ میں تو سیاست کے پیچھے اتنا پاگل ہو رہا ہوں کہ کانگریسی مسلمانوں پر ایک طنزیہ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔میں نے ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کچھ کام کیا تھا اس لئے مجھے ان لوگوں کا بڑا مزیدار تجربہ ہے اگر شاہد صاحب نے اجازت دی تو میں''ساقی''میں بھی سیاست کے متعلق کچھ لکھوں گا''[۵]

پھر ۳/نومبر ۱۹۴۵ کے خط میں ہے کہ''نہیں صاحب میرا سیاسی کام تو باتوں ہی کی حد تک رہا۔ بلکہ اب تو میں نے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں بس ایک دن ایک سیاسی جلسہ میں جا کر ہی جی بھر گیا۔اب تو یہ سوچتا ہوں کہ اپنی کاہلانہ بے راہ روی ہی اچھی۔سیاسی جلسوں میں جا کر مجھے تو صرف ہنسی آتی ہے اور ایک ہی بات پر آدمی کہاں تک ہنسے؟''۔[۶] اصل میں انہیں مسلمانوں کے قومی معاملات سے اتنا شدید تعلق تھا کہ وہ ان کی سیاست سے الگ رہ ہی نہیں سکتے تھے۔کہتے تھے کہ پنجاب کے مسلمان سیاست سے الگ رہ سکتے ہیں کہ وہ اکثریت میں ہیں مگر یوپی (جو عسکری کا آبائی وطن تھا) کے مسلمانوں کی زندگی کا دارومدار سیاست پر ہے اسلئے ''مجھ سے تو خاموش بیٹھا نہیں جاتا۔اب سیاست سے غفلت کے معنی تو اردو ادب سے غداری کے ہیں''۔اس لئے کے سیاسی طاقت کے بغیر زبان وکلچر کا محفوظ رہنا ممکن نہیں۔[۷] اس سلسلے میں وہ ان'' روشن خیال''ادیبوں سے بھی سخت نالاں تھے جو اپنی ادبی سرگرمیوں میں مست رہ کر قومی معاملات سے خود کو الگ رکھتے تھے۔۲۵ رمئی ۱۹۴۶ کے خط میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں میں ایک چیز بڑی قابل افسوس رہی ہے جب ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ شروع ہوئی ہے تو ''روشن خیال''

طبقے نے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھا۔کچھ لوگ لیگ کورجعت پسند سمجھتے رہے۔ کچھ لوگوں کو اس کی کامیابی میں شک رہا کچھ اپنے آپ کو لیگی کہنے سے شرماتے رہے۔غرض کہ اس طبقے نے بڑی مطلب پرستی یا کمزوری کا ثبوت دیا۔جب مسلم لیگ مضبوط ہوگئی تو یہی لوگ ان پرانی ''رجعت پسندانہ'' باتوں کوعوام کا مطالبہ کہنے لگے''[۸]

چونکہ اُس زمانے میں ان کے نزدیک مسلمانوں کے تہذیبی و سیاسی مفادات کی فکر رکھنے والی جماعت صرف مسلم لیگ ہی تھی اس لئے ان کی سیاست بھی مسلم لیگ کے گرد گھومتی تھی اور پاکستان کا قیام ان کے لئے مسلمانوں کے قومی کلچر کو محفوظ رکھنے کا واحد راستہ تھا۔ اُس پرآشوب دور میں وہ غلام عباس کے ساتھ مل کر ایک رسالہ بھی نکالنا چاہتے تھے جس میں مسلم کلچر کے متعلق مضامین ہوں۔[۹] ان کے ۲۵ر فروری ۱۹۴۷ کے خط میں اس رسالے کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہوئے اس میں دیہاتی مسلمانوں کے طرز زندگی، تفکر اوراحساس سے متعلق مضامین لکھوانے کے مشورے ہیں۔لیکن جلد ہی اس رسالے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس دوران ان کی دلچسپی میرٹھ سے شائع ہونے والے پروفیسر کرار حسین کی تحریک (جو خاکسار تحریک سے بچھڑے ہوئے کچھ لوگوں کی نئی تنظیم تھی) کے اخبار ''الامین'' سے ہوگئی تو اپنے رسالے کا خواب یہاں پورا کرنے لگے کہ ''سیاسی مضامین لکھنے کو ہاتھ کھجاتا رہتا'' تھا۔فی الواقع عسکری نے اس میں کچھ مضامین لکھے بھی جن کا موضوع زیادہ تر سیاست اور اس بڑھ کر معاشیات تھا، اور معاشیات بھی کچھ اشتراکی انداز کی۔ اُس وقت انہیں کمیونزم اور اشتراکیت سے خاصا لگاؤ تھا۔'' الامین'' والے مضامین میں ان کا کہنا تھا کہ اب مسلمان ممالک کو سیاسی آزادی تو آہستہ آہستہ مل جائیگی، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی طرح کے غلامی کے جال بھی بچھائے جا رہے ہیں اور وہ ہیں معاشی غلامی کے جال۔نو آزاد ممالک اور مسلم اقوام کے مستقبل کے مسائل میں اس دور میں معاشی مسئلے کو سر فہرست رکھنا عسکری کی سیاسی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔ ان کے ۳۰ر مئی ۱۹۴۷ کے لکھے ہوے ایک مضمون ''اسلامی ممالک اور یورپ کا معاشی جال'' میں آنے والے دور میں معاشیات کی اہمیت اور ایشائی و اسلامی ممالک کے صاحبان اقتدار کی نا اہلی کی پیش گوئیانہ تصویر پیش کی گئی ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں کہ سیاسی آزادی کے بعد مغرب معاشی حکمرانی قائم کرے گا جو خاصی سخت ہوگی اور ''معاشی غلامی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں مشرقی ممالک اب بھی بڑی حد تک محکوم اور مجبور ہوں گے اور امریکہ یا برطانیہ یا روس کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح ہوں گے'' کیونکہ یہاں کے اہل اقتدار طبقے اپنی عوام اور عوامی تحریکوں سے ڈرتے ہیں اور ''سیاسی آزادی ہی کو سب سے بڑی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ سرمایہ داری کے زمانے میں سیاست معاشیات کی ایک خادمہ بن کر رہ گئی ہے''۔نئے آزاد ہونے والے ممالک کی معاشی حالت کی بہتری کے لئے عسکری دو نسخے بتاتے ہیں: ''ایک تو یہ کہ ملک کی صنعتوں کو آہستہ آہستہ ترقی کرنے دیا جائے اور معیار زندگی بلند کرنے کے لئے بے قرار نہ ہوا جائے''۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ نو آزاد مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اپنے عوام اور عوامی تحریکوں سے اپنا تعلق مضبوط رکھنا چاہئے۔[۱۰]

عسکری ۱۹۴۷ء کے زمانے میں معاشیات کی اہمیت پر اتنا زور اس لئے بھی دے رہے تھے کہ ان کی رائے میں اُس دور کی اسلامی تحریکیں مسلمانوں کے لئے سیا ست کی اہمیت تو اجاگر کر رہی تھیں مگر ان کے معاشی مسائل کی طرف ان کی کوئی توجہ نہ

تھی۔عسکری جو اپنی فکر کے ہر دور میں مجرد تصورات کے بجائے زندگی کی ٹھوس شکلوں اور تجربوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، اسلام کے کسی ماورائی اور مجرد تصور کے بجائے اس کے پیروکار مسلمانوں کی تہذیبی وثقافتی زندگی اور ان کی روزمرہ کی ضروریات میں اسلام کی کارفرمائی کو توجہ کا اصل نکتہ سمجھتے تھے۔ اور ان ضروریات میں وہ مسلمانوں کی معاشیات کو بھی ایک اہم اور قابل توجہ مسئلہ قرار دیتے تھے۔ انہیں اس خیال سے بھی سخت اختلاف تھا کہ ''اسلام اور مسلمان الگ الگ چیزیں ہیں، اسلام کی حفاظت کا تو خدا نے روزِازل ہی وعدہ کرلیا ہے، رہے مسلمان تو سارے کے سارے ختم بھی ہو گئے تو کیا حرج ہے''۔[11] لہٰذا وہ مسلمانوں کے کلچر، تاریخ اور معاشی معاملات سے بے توجہی برتنے والی ان اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں اشتراکیت وکمیونزم کے معاشی نظام کو بھی ہمدردانہ مطالعے کا مستحق سمجھتے تھے، جو ان کے اس وقت کے خیالات کیمطابق سرمایہ دار ملکوں کے معاشی جال کے خلاف ایک موثر ہتھیار تھا۔ اسی زور میں مئی ۱۹۴۷ کی ایک تحریر میں وہ ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جو آج حیرت انگیز معلوم ہونگی:

> ''اِن لوگوں (اسلامی تحریکوں) نے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ آدمی اس وقت تک اشتراکی ہو ہی نہیں سکتا جب تک خدا سے انکار نہ کرے۔حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ اشتراکیت فی نفسہٖ نہ تو الٰہیات ہے نہ فلسفہ نہ مافوق الطبیعیات۔ یہ تو بنیادی اعتبار سے سماجی اور معاشی نظام کا ایک نظریہ ہے، اس میں خدا کو ماننے نہ ماننے کا کیا سوال ہے۔''[12]

آگے ان حالات کا ذکر کرتے ہوے ،جنہوں نے اشتراکی رہنماؤں کو خدا کا انکار کرنے پر مائل کیا، ان رہنماؤں کی انتہا پسندی کو غلط بھی قرار دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی معاشی نظام کیلئے ہمدردی کے اتنے اونچے سُر عسکری کی بعد کی تحریروں میں کم ہی آئے ہیں ۔ان کے اُس دور کی تحریروں کو اگر سامنے رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس وقت اسلام اُن کے لئے کسی شعوری قبولیت کے بجائے محض ایک کلچری وراثت کا معاملہ تھا۔ مسلمانوں اور ان کی تاریخی وتہذیبی وراثت کو وہ ہر حال میں محفوظ رکھنے کے خواہاں تھے، حال آنکہ اس وقت وہ اس اسلام کے بعض پہلوؤں کے بارے میں سخت تشکیک کا شکار تھے۔ان کا اُسی زمانے کا ایک خط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد ، نوشتہ ۸ جولائی ۱۹۴۷عسکری کی فکر اور رجحانات کی ایک خاص رو کی بڑی مفصل تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے مضمون (اشارہ غالباً ''الامین'' والی اسی محولہ بالا تحریر کی طرف ہے)میں کمیونزم کا مطالعہ کرنے کی جو رائے دی ہے وہ اس لئے ہے کہ مولانا مودودی کی جماعت نہیں چاہتی کہ مسلمان ، کمیونزم سے آگاہ ہوں .... یوں تو یہ پورا خط ہی بہت اہم ہے، لیکن اس کا مندرجہ ذیل اقتباس اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس میں ان کی مذہبی تشکیک کی طرف بھی اشارے ہیں :

> ''دوسری بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو Material Dialectics کا مطالعہ کرنا چاہئے یا روس کے موجودہ معاشی نظام کا ؟روس کے موجودہ معاشی نظام میں بہت سی باتیں قبول کرنے کے قابل ہیں ،مگر مادی جدلیات میں؟ مادی جدلیات میں انسانی زندگی کے بارے میں کیا بات کہی گئی ہے؟اس فلسفے کا نتیجہ روس میں یہ ہوا ہے کہ وہاں کے لوگوں میں ایک قسم کی Tribalism آ گئی ہے۔ رہا سوال ان لوگوں کا جو اسلامی معاشی نظام کو بہترین سمجھتے ہیں، تو

مجھے یہی پتہ نہیں چلا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ میرے خیال میں مختلف قسم کے ٹیکس وغیرہ جو خلیفاؤں وغیرہ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے مقرر کئے ہیں اور یہ چیزیں بالکل وقتی اور اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔جب مسلمان شیر شاہ سوری کا نظام قبول کر سکتے ہیں تو کمیونزم میں کیا خرابی ہے؟ میں اسلام کی حقانیت کا قائل ہوں۔ میں تو واقعی اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میں اسلام کو مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ۔ لیکن فرض کیجئے کہ اسلام کی حفاظت کا پورا انتظام ہو گیا اور اس کے بعد پتا چلا کہ اسلام اس قابل ہی نہیں کہ ۴۷ء کا انسان اس سے کوئی روحانی ترقی حاصل کر سکے تو پھر؟ بات یہ ہے کہ میں تو اسلام سے بڑا غیر مطمئن ہوں۔مگر میری طبیعت میں ایک قسم کی قدامت پرستی ہے, جو نہیں چاہتی کہ اسلام کی موجودہ صورتیں برباد ہوں ۔لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے،لیکن اسلام زندہ ہو رہا ہے کہ دبی ہوئی قوتیں؟ بڑے ٹیڑھے مسئلے ہیں۔لیکن معلوم ہوتا کہ ہندوؤں کا خطرہ مجھے ان مسائل پر ایمانداری سے سوچنے نہیں دے گا۔مصیبت یہ ہے کہ کسی کتاب سے مدد بھی تو نہیں ملتی ۔اقبال تک سے میری تشفی نہیں ہوتی اور مجھے تو اسلام بڑا mediocre مذہب نظر آتا ہے.....''۔[۱۳]

ایک طرف تو اس وقت اسلام کے بارے میں یہ شکوک، اور دوسری طرف ان کی طبعِ سیاست پسند (''آج کل میرا ادب سے تعلق بہت فروعی قسم کا رہ گیا ہے کچھ عجب حالت ہے۔سیاست کا غلبہ ہے''۔[۱۴] کی جولانیاں کہ عین تقسیم کے پر آشوب ایام میں ''مسلم عوام اور مسلم اور اردو تہذیب'' کو ہندوستان میں بیگانہ اور اجنبی ہونے سے بچانے کے لئے وہ میرٹھ میں ایک عظیم الشان ''مسلم کلچرل کانفرنس'' منعقد کرانے کی فکر میں غلطاں تھے، اس کا ایجنڈا ان کے نزدیک یہ تھا کہ ''مسلمانوں کے اندر اپنی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے محبت پیدا کی جائے''۔اس مقصد کے لئے وہ لیگی زعماء سے مل رہے تھے، ادیبوں کو خط لکھے جا رہے تھے اور ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں سے ہند اسلامی کلچر کے مختلف رنگ دکھانے کے لئے ثقافتی طائفے بلانے کے پروگرام بنائے جا رہے تھے ۔ اسی زمانے میں عسکری میرٹھ کی ایک انجمن اسلامیات میں ''اسلام اور اٹامک ایج اور اسلام اور ایٹم بم'' جیسے موضوعات پر بھی ،خواہ لطیفے کے طور پر ہی سہی، سوچنے لگے تھے۔[۱۵] یہی وہ دور ہے جس میں عسکری مسلم کلچر کی نوعیت پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے اور'' لوٹے کی ٹونٹی'' میں بھی مسلم کلچر کی امتیازی شان دیکھ رہے تھے کہ اس میں بھی ایک عملی آسانی اور حسن ترتیب موجود ہے۔مسلم کلچر کے انفرادی خدوخال اور اس کے دیگر فنی مظاہر سے انہیں بے حد دلچسپی تھی اور وہ ہر طرح سے انہیں محفوظ رکھنے کے خواہاں تھے ۔

عسکری کے درج بالا خیالات تقسیم ہند کے گرد و پیش کے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کی توجہ دیگر ادبی معاملات کے ساتھ ساتھ پاکستانی تہذیب و ثقافت کے مسائل سے ہوگئی۔ وہ ساتھی ادیبوں کو پکار پکار کر ملک و قوم کی امنگوں سے تعلق جوڑنے اور پاکستان میں ایک نئی بوباس والے ادب کی تخلیق پر مائل کرتے رہے۔مگر جلد ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ صرف ادیب و دانشور ہی نہیں بلکہ حکومت وقت کو بھی ملک کے تہذیبی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اس لیے جلد ہی ان کی توجہ ملکی امور اور دیگر ادبی مسائل سے ہٹ کر کچھ عرصے کے لئے عالم اسلام کی طرف ہوگئی تھی اور جسے بعض حلقوں میں ان کی روس دوستی پر بھی قیاس کیا گیا ہے ۔

ہوا یوں کہ ملکی سیاست میں جب انہیں تبدیلی یا بہتری کے کوئی امکان نظر نہیں آ رہے تھے، اور ذاتی مایوسی کے ساتھ ساتھ ملکی حالات سے بھی مایوسی ہوتی جارہی تھی، اسی زمانے (۱۹۵۶ء) میں جمال عبدالناصر کی طرف سے نہر سوئز کو قومیائے جانے پر فرانس اور برطانیہ نے ملکر مصر پر حملہ کردیا اور نتیجتاً جمال عبدالناصر نے عرب دنیا کو اتحاد کی دعوت دے ڈالی۔ سیاست اور خصوصاً عالم اسلام کی سیاست عسکری کی ہمیشہ سے کمزوری تھی۔ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام میں ان کے اندر جو جذبہ تھا وہ دوبارہ عود کر آیا اور سن ۴۹-۴۸ء کی طرح ایک دفعہ پھر عالم اسلام کی وحدت کی آرزوئیں ان کے اندر موجیں مارنے لگیں۔ پاکستان کی حکومت تو پہلے ہی سے خود کو امریکہ کے حبالۂ رفاقت میں دے چکی تھی، اس لئے عسکری کی نظریں بار بار عوام اور ادیبوں کی طرف اٹھنے لگیں۔ انہوں نے ادیبوں کی بے حسی پر ماتم کرتے ہوئے انہیں جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ اور اپنے دل کی بھڑاس اخبار ''امروز'' کے کالموں میں نکالی۔ ''پاکستانی ادیب اور مصر'' کے عنوان سے ایک مراسلہ لکھا جس میں انہوں نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ حلقہ ارباب ذوق والوں کی بھی خوب خبر لی کہ اتنے بڑے واقعے پر پاکستانی ادیب خاموش کیوں ہیں۔ اسی دوران انہوں نے ''تھینک یو امریکہ'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا جس میں دانشور اور صحافتی طبقے کیساتھ ساتھ حکومتی طبقوں کے بھی لتے لیے۔ روس کی طرف سے مصر کی حمایت اور امریکی رویے کا ذکر کرتے ہوئے عسکری اس میں لکھتے ہیں:

> '' مصر کے معاملے میں امریکہ نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر ہمارے کئی بااثر اخبارات پردہ ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں یہ بات ایک عام پاکستانی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ادیب کی حیثیت سے کہتا ہوں، اور اگر کسی کے ڈر سے نہ کہوں تو حافظ، میر، غالب، اقبال، شیکسپیئر، جوائس اور بودیلیر کی روح سے غداری کروں گا۔ عالم گیر جنگ کے خطرے کے باوجود مصر کی حمایت میں انگلستان اور فرانس کو الٹی میٹم دیکر روس نے انسان کی لاج رکھ لی ... اگر دو عظیم فوجی طاقتیں ہسپتالوں، کتب خانوں اور سکولوں پر بم برساتی رہیں اور ساری دنیا اطمینان کیساتھ بیٹھی تماشا دیکھتی رہے، اگر انسانی ارتقاء کے یہی معنی ہیں تو سارے ادب کو آگ لگا دینی چاہئے۔ اس موقعے پر روس کے الٹی میٹم کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ضمیر ابھی تک مرا نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ میرے ملک میں ایسے اخبار بھی ہیں جو متارکہ جنگ کے سلسلے میں آئزن ہاور کا شکریہ ادا کرہے ہیں، اور اسے امن کا دیوتا کہہ رہے ہیں۔ (اُس) آئزن ہاور کو، جس نے اعلان کردیا ہے کہ اگر روس نے مصر کی حمایت کی تو امریکہ برطانیہ، فرانس کی طرف سے بولے گا... یہ اخبار حالات کو اس طرح پیش کرہے ہیں گویا پاکستان اور امریکہ کا مفاد ایک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ پنڈت نہرو کی طرح ہنگری اور مصر کا نام ایک ساتھ لے رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت مشرقی یورپ زر پرستوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا تو اسلامی ممالک کے گلے میں پھانسی کا پھندہ پڑ گیا تھا۔ لیکن ہمارا فرض تو یہ قرار پایا ہے کہ اسلامی ممالک کا اور ساتھ میں پاکستان کا جو بھی حشر ہو بہرحال تھینک یو امریکہ کہے جائیں''۔[۱۶]

آخر میں عسکری نے حکومتِ پاکستان کا یوں کھلے بندوں ایک اسلامی ملک کا ساتھ دینے کے بجائے امریکہ کی حمایت کرنے کو بھی

تنقید کا نشانہ بنایا تھا: ''جناح اور اقبال کی روح کدھر ہے جو 'تھینک یو امریکہ' رٹنے کے بجائے ہمیں للکارے''۔

غالباً یہی وہ مضمون ہے جس کے مندرجات کے حوالے سے انتظار حسین نے لکھا تھا کہ اب انہوں (عسکری) نے ''سویٹ روس سے بھی دوستی کر لی اور ایسی دوستی کہ ہنگری میں روسی اقدام بھی انہیں جائز نظر آنے لگا''۔ اور کچھ ایسے ہی رویوں کی بنا پر سید سبط حسن بھی عسکری کے قائل ہوگئے تھے۔ بظاہر تو اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ جمال عبد الناصر کے عرب نیشنلزم کے نعرے سے، جو ایک انقلابی قوت نظر آ رہا تھا، عسکری محسوس کرنے لگے تھے کہ عالم عرب کا یہ اتحاد، عالم اسلام کے اتحاد کا پیش خیمہ ہوگا اور اسطرح مسلمان اقوام یورپ و یہود کے پنجے سے نجات پاجائیں گی۔ اس جدوجہد کو چونکہ روس کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی، اس لئے عسکری کا روس کی طرف رویہ فطرتاً ذرا نرم ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں سبط حسن جیسے ترقی پسندوں سے بھی ان کا یارانہ ہوگیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سویت روس میں ادب اور تہذیب کی طرف نئے رجحان انہیں ۱۹۵۴ء میں نظر آنے لگے تھے۔[۱۷]

غرض کہ اتحاد عالم اسلامی کے آدرش اور امریکہ و یورپی اقوام کی مسلمانوں کے خلاف نفرت وعصبیت کے مسائل نے ایک بار پھر ان کے دامن کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ ان کا مضمون ''معصومان یورپ اور اسلام'' (۵۸-۱۹۵۷ء) مسلمانوں کے خلاف یورپی عصبیت کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے کہ اگر اس میں یہاں وہاں تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے تو یوں محسوس ہوگا کہ آج شام عراق اور افغانستان کے پس منظر میں امریکہ و یورپ عالم اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جس ''دہشت گردی'' کے تصور کو فروغ دے رہے ہیں یہ مضمون اسی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں پر جس قسم کے الزام آج لگائے جارہے ہیں، نہر سوئز کو قومیانے پر بھی ان کے بارے میں کچھ ایسی ہی باتیں کی گئی تھیں۔ فرانسیسی سامراج کے خلاف الجزائر کی مزاحمتی جنگ کی حمایت میں عسکری اپنے پسندیدہ ملک فرانس کے بھی خلاف ہوگئے تھے۔ وہ سارتر کے اور زیادہ گرویدہ ہوگئے، اور ''باغی'' کا مصنف کامیو ان کی نظر سے گر گیا کہ اول الذکر اپنے ملک کے خلاف الجزائر کی جدوجہد آزادی کا حامی اور ثانی الذکر اس کے خلاف تھا۔ ۵۸ء میں لاہور میں عسکری نے سبط حسن وغیرہ کیساتھ مل کر یوم الجزائر منایا اور اس کے لئے ''الجزائر اور نیا انسانی شعور'' (جون، ۵۸ء) کے عنوان سے مضمون بھی لکھا۔ اس زمانے میں الجزائر ان کی امیدوں کا مرکز تھا کہ ان کے نزدیک اس کے ریگزاروں میں کشمیر وفلسطین کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی مضمون لکھے اور الجزائری ادیبوں کے تراجم بھی کئے۔

عسکری کی ان ساری سرگرمیوں کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان کے نزدیک پاکستان اور دیگر مسلمان ملکوں کی آزادی کا مطلب صرف یورپ کے معاشی پھندے سے نکل کر اپنے عوام کی طاقت اور اپنے صنعتی وسائل کی بنیاد پر خودمختار ریاستیں قائم کرنا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں ایک وسیع تر اسلامی بلاک کی صورت میں متحد بھی ہونا تھا۔ ان کے خیال میں اس بلاک کے بننے میں دو رکاوٹیں تھیں: ایک مسلمان ملکوں کے صاحبان اقتدار جو اپنے عوام سے خوفزدہ تھے، دوسرے سرمایہ دار ممالک جو اس اتحاد کو اپنے معاشی مفادات کے لئے سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے تواتر سے اس مسئلے پر لکھا تھا۔ مگر پاکستان کے بعد کے حالات نے ان پر مایوسی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ ۵۶ء میں جب عرب اتحاد کے چرچے ہونے لگے تو انہیں پھر اسی خواب کی تکمیل کا امکان نظر آیا، ان کی آرزوئیں پھر جاگ اٹھیں۔ اس دوران جب ایک

طرف وہ ادبی جمود و انحطاط کی بات کر رہے تھے ان کے قلم سے مغربی ممالک اور امریکہ کی زر پرست معاشرت اور معیشت پر مسلسل تنقید جاری رہی اور پھر جب مسلمان ملکوں کے تیل کے وسائل پر قبضہ و تصرف جمانے کی مہم میں امریکہ بھی یورپی ممالک کی پشت پناہی پر آ گیا تو ان کے قلم سے الفاظ نہیں شعلے نکلنے لگے۔ اس دور میں ان کی جس تحریر کا تعلق کسی ادبی مسئلے سے نہیں وہ ضرور امریکی استعمار اور زر پرستی کے پول کھولتی نظر آتی ہے۔ اور ان تحریوں کو آج بھی پڑھا جائے تو اتنی ہی بروقت محسوس ہوتی ہیں، بلکہ مسلم ممالک کے بارے میں امریکہ کی آئندہ پالیسیوں کی حیرت انگیز پیش بینی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے ایک مضمون ''۱۹۵۷ء کا غدر'' کے یہ الفاظ دیکھئے جس میں ۱۸۵۷ء کے سانحے کا تقابل ۱۹۵۷ء میں مسلمان ممالک کی صورتحال سے کیا گیا ہے:

''امریکہ والوں کی خوشحالی کا انحصار اس بات ہر ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے قدرتی ذخائر اور تجارتی منڈیاں ان کے قبضے میں ہوں۔ (یہ میں) آئزن ہاور کی تقریر کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ ابھی جنوری ہی میں آئزن ہاور نے...کہا ہے کہ امریکہ کی خوشحالی کا انحصار دوسرے ملکوں کو مالی امداد دینے پر ہے...امریکہ کا معاشی نظام اس منزل پر آ پہنچا ہے کہ یا تو پھیلے اور بڑھے یا پھر اندرونی زور سے پھٹ کر برباد ہوجائے۔ چنانچہ امریکی طرز زندگی کی منطق نے امریکہ کو استعماری طاقت بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ اردن کے ہنگاموں نے تو بات بالکل ہی صاف کر دی۔ بیروت میں اپنی فوجیں بھیج کر امریکہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر ملک سے اپنی بات ہائیڈروجن بم کے زور سے منوائے گا اور کسی ملک کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ خوددار انسانوں کی طرح اپنی زندگی کی تشکیل اپنی مرضی سے کر سکے...''

آخر میں امریکی امداد اور لائف اسٹایل کا ذکر کرکے کہتے ہیں کہ

''لیکن اگر 'معیار زندگی' کا جادو ہم پر اس حد تک چل چکا ہے کہ ہم کوکا کولا پینے کے لئے مشرق وسطی کا مستقبل تک بیچ سکتے ہیں تو پھر تاریخ کی اٹل منطق سے کسی رعایت کی امید رکھنی فضول ہے''۔[۱۸]

فرائڈ کے مقابلے میں یونگ کی نفسیات اور اس کی ''جعلی روحانیت'' کو بھی وہ زر پرستی ہی سے جوڑتے رہے:

''زر پرست دنیا کا پیغمبر فرائڈ نہیں بلکہ یونگ ہے جس کا عقیدہ ہے کہ زر پرستی، جھوٹ، نمائش پسندی، اور ریاکاری کے سماجی ماحول میں رہ کر بھی بلکہ اس ماحول سے سمجھوتا کر کے بھی ذہنی صحت اور روحانی ترقی ممکن ہے ... میں یہ نہیں کہتا کہ یونگ نے نفسیات کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ میں یونگ سے شدید نفرت کرتا ہوں لیکن اس نفرت کے باوجود یونگ کی کتابیں خریدتا رہوں گا، پڑھتا رہوں گا، ان سے فائدہ حاصل کرتا رہوں گا۔ فرائڈ سے مجھے شدید محبت ہے، لیکن میں نے اس کتابیں پڑھنی چھوڑ دی ہیں ...لیکن یونگ کو جسطرح آگے بڑھایا جارہا ہے وہ انسانیت، علم، اور ادب بلکہ بنیادی اخلاقیات کے لئے بھی ایک عظیم خطرہ ہے۔ یونگ کی عالمگیر مقبولیت سے اگر کسی چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے تو وہ جھوٹ، ریاکاری، اور نمائش پسندی میں''۔[۱۹]

زر پرستی اور تنقید، سرمایہ داری اور تنقید جیسے ادبی، نفسیاتی اور سماجی مسائل پر ان کے قلم سے جو بھی تحریریں نکلی ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح ادب، تہذیب، اور مشرقی اقوام کے بارے میں سرمایہ دار ملکوں اور بطور خاص امریکی عزائم کے پول کھولنے سے

ہے۔''زر پرستی اور شعور ذات''(جنوری ۵۷ء) میں فرائڈ کی تحلیلِ نفسی کے اس اصول کے مقابلے میں، کہ انسان ذہنی صحت صرف خود آگاہی کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے، امریکہ میں پائے جانے والے اس رجحان کا ذکر کرتے ہیں جس کے مطابق ذہنی صحت صرف سکون آور ادویات سے حاصل ہوسکتی ہے۔عسکری اس رجحان کے مضر اثرات کے باب میں لکھتے ہیں کہ اس سے صرف یہ ہوتا کہ ایک مرض کی جگہ دوسرا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دواؤں کی ایک سیاسی اور سماجی معنویت بھی ہے ۔ ان دواؤں سے گائیں دودھ تو نہایت سکون سے دیتی ہیں مگر دودھ میں غذائیت کم ہوجاتی ہے:

> '' یہ دوا کھانے کے بعد مرغیاں اتنی بردبار ہوجاتی ہیں کہ دڑبے میں پانچ کے بجائے دس بھر دی جائیں تو بھی چوں نہیں کرتیں۔ چنانچہ یہ دوائیں انسانوں کو بھی بردبار بنا سکتی ہیں ۔'' لائف'' کے ایک مضمون نگار نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ مشرق وسطیٰ کے لوگ بہت گڑبڑ کرتے ہیں ، یہ دوالے جا کر وہاں کے کھیتوں میں چھڑکی جائے''[۲۰]

۵۷ء میں لکھی اس تحریر پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں کہ آج مشرق وسطیٰ سمیت اکثر مسلمان ممالک میں ''بردبار مرغیوں'' کی عظیم اکثریت خود اس پر گواہ ہے۔ اس زمانے میں عسکری مصر اور الجزائر کے مسئلے پر لکھتے ہوئے جس طرح امریکہ و دیگر سرمایہ دار ملکوں کے معاشی جال کو پھیلتا ہوا دیکھ رہے تھے اور حکومت پاکستان بھی جس طرح امریکی حلقہ اثر میں آتی جارہی تھی، اس پس منظر میں روس کی طرف ان کا رویہ کچھ نرمی کا ہوگیا تھا۔ ورنہ جہاں تک پرانے ترقی پسند تصور ادب کا تعلق ہے ان کے نقطہ نظر میں کبھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ البتہ اب روس کے اسپتنک چھوڑنے کے زمانے میں انہیں روسی ادیبوں میں ادب اور زندگی کی طرف ایک نیا صحت مند رجحان بھی نظر آنے لگا تھا۔[۲۱] اگرچہ اب وہ سائنس اور سائنسی تصور حیات کے ہاتھوں انسان اور انسانی تہذیب کی خرابی کی بھی پیش بینی کررہے تھے۔ اور خاص اس حوالے سے روس کو بھی امریکہ و دیگر سرمایہ دار ملکوں کے ذیل میں رکھتے تھے۔لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ سن ۵۷۔ ۱۹۵۶ء میں ان کے اندر امریکہ دشمنی کی وجہ سے روس کے لئے خاصے نیک جذبات پائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۳ء میں ممتاز شیریں کی کتاب معیار پر دیباچہ لکھتے ہوئے کتاب کے مندرجات کی جہاں تائید کی تھی وہاں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھا تھا کہ'' آج سے دس سال پہلے جو اعتراضات روس پر وارد ہوئے تھے وہ اب اتنے درست نہیں رہے۔ آج یورپ اپنی بہترین تہذیبی اقدار کو اپنے ہاتھ سے مٹا رہا ہے اور ان اقدار کے لیے اگر کوئی پناہ گاہ رہ گئی ہے تو روس ہے''۔[۲۲] اس معاملے میں اتنی شدت تھی کہ جب شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' کا سویت روس کے خلاف ایک خاص نمبر نکالا تو عسکری نے اس خیال سے کہ انہوں نے اپنے رسالے کے وسائل میں اضافے کی خاطر امریکی اداروں کے فراہم کردہ مسالے سے یہ خصوصی نمبر تیار کیا ہے، شاہد احمد دہلوی اور ساقی سے اپنا برسوں پرانے تعلق ختم کر لیا تھا ۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو امریکہ کے بارے میں عسکری کی ان زہر خند تحریروں اور منٹو کے ''چچا سام کے نام خطوط'' میں اسلوب کے فرق کے باوجود معاصر عالمی سیاست پر ذہنی رد عمل کی حیرت انگیز مماثلتیں نظر آتی ہیں۔

روس کے بارے میں بعد کے اور یہاں کے ترقی پسندوں کے بارے میں عسکری کے ۴۹۔۱۹۴۷ء کے رویّوں میں'' تضاد'' تلاش کیا جاسکتا ہے ۔لیکن اگر عسکری کے اندر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف ہمیشہ کی نفرت کو سامنے رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ وہ

۱۹۴۷ء کے دور میں بھی سرمایہ دار مغربی ممالک کی پالیسیوں کے اتنے ہی مخالف تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ قیام پاکستان کے زمانے میں کشمیر و دیگر قومی و تہذیبی مسائل کے بارے میں وہ ترقی پسندوں کی سیاسی سرگرمیوں اور ان کے نظریہ ادب سے اختلاف کی بنا پر ان سے لڑ رہے تھے۔ لیکن بعد میں حکومتی پکڑ دھکڑ اور ترقی پسند تحریک کے زوال کی وجہ سے ان کی مخالف اور لڑائی کی رخ مغرب کے سرمایہ دار ملکوں اور ان کی پالیسیوں کو قبول کرنے والی حکومتوں (بشمول پاکستان) کی طرف ہوگیا؛ اور چونکہ بائیں بازو کے بین الاقوامی رجحانات بھی سرمایہ داروں کے خلاف تھے، لہٰذا عسکری نے ان کی ہم نوائی بھی کی۔ ان کے اس طرز عمل کو ان کے ۵۶ ۔ ۱۹۵۵ء کے ادبی ضامین میں بھی دیکھنا مفید ہوگا۔ سبط حسن کے نام ان کے خطوط، (مطبوعہ غالب شمارہ ۱۔۲) کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ ان کے معروف مضمون ''آدمی اور انسان'' (۱۹۵۶ء، مشمولہ *ستارہ یا بادبان*)، کو بھی اسی بدلے ہوئے تناظر میں دیکھنا چاہئے، جو اس مسئلے پر ان کے پہلے مضمون ''انسان اور آدمی'' (۱۹۴۸ء، مشمولہ *انسان اور آدمی*) کے آٹھ برس بعد لکھا گیا۔ ان مضامین میں آمدہ مسائل کا عسکری کے ادبی، تہذیبی اور مذہبی تصورات سے گہرا تعلق ہے۔

عسکری یہ سب کچھ خارجی طور پر مصر و الجزائر کے حوالے سے عالم اسلام کے اتحاد کی خواہش اور باطنی طور پر آدمی و انسان کے مسائل کی تفتیش کے دور آخر میں اس وقت کر رہے تھے۔ اس دور میں ان کے اندر پائے جانے والے اس اضطراب کی تصدیق ان کے بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ''میں تو بس دیوانگی کے قریب پہنچ چکا ہوں، شاید آپ کے آنے سے کچھ افاقہ ہو''۔ ۲/اگست ۵۶ء کے ایک خط میں اسلامیہ کالج، لاہور میں آنے اور کراچی چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کے تذبذب کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ''آج کل میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ دن بھر لارنس پڑھتا ہوں اور مضمون وغیرہ لکھنے کی تجویزیں سوچتا ہوں۔ ایک جی چاہتا ہے کہ ملازمت بالکل ہی چھوڑ دوں اور گھر پڑا رہوں، کچھ لکھوں لکھاؤں۔ آجکل روز میرے ذہن میں ایک نیا موضوع آتا ہے، مگر انگریزی میں لکھنے کو جی چاہتا ہے اردو لکھنا تو جیسے میں بھول ہی گیا''۔ ۲۳

۱۰/ستمبر ۱۹۵۶ کے ایک خط میں بھی کچھ گوشہ گیری کی خواہش ہے: ''یار میں جان بوجھ کر لاہور نہیں آیا آجکل میں اعتکاف بیٹھ گیا ہوں۔ گھر سے بالکل نہیں نکلتا۔ لاہور آکے فضول ادیبوں کی چپقلش میں گرفتار ہوجاتا۔ اب میں افسانے لکھنے کی فکر میں ہوں''۔ افسانے تو پھر وہ عمر بھر نہ لکھ سکے اگرچہ دل سے یہ خواہش کبھی رخصت نہ ہوئی تھی۔ ۱۲/دسمبر ۱۹۷۳ء، جب وہ ''ماورائے'' ادب جا چکے تھے، کے ایک خط میں پیرس میں زیر تعلیم اپنی ایک شاگرد لبنیٰ کے حوالے سے وہاں کی تعلیمی اور ادبی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اب میں چوبیس برس بعد ایک افسانہ لکھتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ مغرب کا کیا حشر ہو رہا ہے''۔

بہرحال تبدیلی حال کا سلسلہ، جس کا زمانہ ۵۸-۱۹۵۶ء کا ہے، جاری رہا۔ افسوس ہے کہ ان کے اس زمانے کا کوئی خط ہمیں دستیاب نہیں جس سے اس عبوری دور کا حال معلوم ہوسکے۔ عسکری کے دوست انتظار حسین اور ڈاکٹر آفتاب احمد، دونوں نے اس عرصے میں عسکری کے ایک ''دور خاموشی'' کا ذکر کیا ہے، جس کا ایک سبب اکتوبر ۵۸ء کے مارشل لاء کو بھی بتایا گیا ہے: ''عین اسی ہنگام میں (جب وہ مصر اور الجزائر کے معاملات پر لکھ رہے تھے) ایوب خان کا مارشل لاء آگیا۔ عسکری کا قلم پھر رنجک چاٹ گیا۔ پھر دوبارہ رواں ہوا تو اس کا راستہ ہی بدلا ہوا تھا۔ فلابیر، جوائس، پاؤنڈ سب پیچھے رہ گئے تھے۔ اب ابن العربی تھے، رینے

گیئوں تھے''۔ ڈاکٹر آفتاب نے اس تبدیلی کے فوری اسباب میں ان کے کچھ ذاتی معاملات کو بھی شمار کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی ذہنی زندگی میں ایک انقلاب آنا شروع ہوا...اور ۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد اس کی رفتار اور تیز ہوگئی ...انہوں نے واقعی ایک قسم کا مراقبہ اختیار کر رکھا تھا۔لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر تصوف اور دینی مسائل پر کتابیں پڑھنے لگے تھے اور اس شغل میں ان کا انہماک دیدنی تھا....۔ ایک نیا صدمہ کہ جس کی نوعیت اگرچہ بالکل مختلف تھی عسکری کے لئے ایک تازہ محرومی لے کر آیا۔ مارشل لاء نے ان کا سب بڑا اثاثہ یعنی قلم چھین لیا اور یوں وہ اپنی شخصیت کے سب سے قوی تقاضے کی تسکین یعنی اظہار سے محروم ہوگئے۔عسکری کے ہر وقت مصروف رہنے والے ذہن کا تقاضائے اظہار ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ سیاسی سطح پر جبر واستبداد سے نبرد آزما ہونا عسکری کے بس کی بات نہیں تھی وہ تو ایک کھلی اور آزاد فضاء میں قلم کی ہی جنگ لڑ سکتے تھے۔لیکن اب اس کا امکان بھی ختم ہوگیا تھا۔لہٰذا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ ایک قسم کے مراقبے میں چلے گئے تھے اور آخر کار ان کی ''واماندگئ شوق'' انہیں اسلام کے دینی اور متصوفانہ فکر کی راہ پہ لے آئی کہ جس میں اظہار پر کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی۔ڈیڑھ دو برس کے مراقبے کے بعد جب عسکری ایک نئے ماہ نامے ''سات رنگ'' کے صفحات پر طلوع ہوئے تو وہ ایک دوسرے عسکری تھے۔'' [۲۴]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مارشل لاء کا نفاذ ''کھلی اور آزاد فضاء'' کے قائل عسکری کے لئے ایک بڑا صدمہ ثابت ہوا ہوگا۔ لیکن کیا واقعی مارشل لا نے ان کا قلم بھی چھین لیا تھا؟ اس امر کو ہم عسکری کی اس عرصے کی تحریروں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں : ایوبی مارشل لا، ۱۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو لگا تھا۔صحافتی دنیا پر اس کے فوری اثرات اچھے نہ تھے۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے لئے تو یہ ''پر امن انقلاب'' بڑا بھاری پڑا۔ بقول ضمیر نیازی کے ایک ہفتے کے اندر ہفتہ وار ''لیل ونہار'' کے ایڈیٹر سید سبط حسن اور کچھ عرصے بعد ''امروز'' کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور تھوڑے دنوں بعد فیض احمد فیض سے بھی یہی سلوک ہو۔(ضمیر نیازی، *صحافت پابند سلاسل*، ص ۱۱۹) مصر و الجزائر وغیرہ کے مسئلے پر عسکری سبط حسن اور فیض جیسے ترقی پسندوں کے قریب آ چکے تھے۔ کچھ اس سبب سے اور کچھ آزادی اظہار کے سختی سے قائل ہونے کی بنا پر انہیں قدرتی طور پر اس کا بہت صدمہ ہوا۔ جب انہیں ان گرفتاریوں کی خبر ملی تو بقول آفتاب احمد ''عسکری بالکل سناٹے میں آ گئے، اردو ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ انگریزی میں کہا This is cold terror اور خاموش ہوگئے۔'' [۲۵] یاد رہے کہ عسکری کا یہ ردعمل کسی وقتی سیاسی مصلحت کے تحت نہیں تھا بلکہ ۴۹۔ ۱۹۴۸ء میں جب اس وقت کی مسلم لیگی حکومت نے کچھ ترقی پسند رسالوں اور ادیبوں کے لئے سخت گیری کی پالیسی اختیار کی تو باوجود اس کے کہ تب عسکری ترقی پسندوں کے خلاف ہر محاذ پر لڑ رہے تھے، انہوں نے اسی طرح کے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔مارشل لا کا یہ عتاب صرف دنیائے صحافت پر نہ پڑا تھا بلکہ ادبی حلقوں پر بھی اس کی بڑی دہشت طاری ہوئی تھی۔

۵۸ء میں عسکری نے جو آٹھ نو مضامین لکھے ان میں زیادہ تر اکتوبر ۵۸ کے مارشل لاء سے قبل کے ہیں ۔ مثلاً میر پر دو مضمون (ساقی میر نمبر، ستمبر ۵۸ء) اور الجزائر و اسلامی دنیا کے معاملات سے متعلق مضامین جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ

صرف ''رومال کی زنجیر'' (۱۹۵۸ء) ایک ایسا مضمون ہے جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ مارشل لاء سے قبل کا ہے یا بعد کا۔ لیکن اس مضمون کے موضوع میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے اسے مارشل لا کے بعد کی تحریر سمجھا جا سکے۔ایک تو اس کا اسلوب جو عسکری کے سابق رواں دواں اور واضح اسلوب کی طرح کا نہیں اور دوسرا اس کا موضوع جو نہ صرف کسی فوری سیاسی و قومی مسئلے سے متعلق نہیں بلکہ ادب اور خاص طور پر اردو ادب سے بھی اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ۔ اور کچھ ایسا ہی انداز ان کی ایک بعد کی تحریر'' حکایت نے'' (۱۹۵۹ء) کا بھی ہے ۔ جو کسی تجریدی افسانے کی مد میں رکھے جانے کے قابل ہے۔اسی دور میں عسکری کی مذہب یا تصوف کی طرف سنجیدہ رغبت کا پہلا سراغ ان کے مضمون ''محسن کاکوروی'' (۱۹۵۹ء) سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور پھر ۱۹۶۰ء میں لکھے جانے والے ''سات رنگ'' والے مضامین (جو اب زیادہ تر ان کی کتاب *وقت کی راگنی* میں شامل ہیں) میں یہ رنگ بہت واضح ہوکر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا انتظار حسین اور ڈاکٹر آفتاب احمد عسکری کے اس ذہنی انقلاب سے قبل ان کی 'ڈیڑھ دو سال کی خاموشی'/ایک قسم کے مراقبئے کے قائل ہیں جس کا ایک سبب مارشل لاء کا نفاذ بھی بتایا جاتا ہے۔لیکن جمال پانی پتی نے اس بات سے شدید اختلاف کیا ہے اور عسکری کے مضامین ''رومال کی زنجیر''، ''حکایت نے''، ''محسن کاکوروی'' اور اکتوبر ۶۰ سے پہلے لکھے گئے ''سات رنگ'' والے مضامین کی شہادتیں پیش کر کے ڈیڑھ دو سال کے مراقبے والے مفروضے کی سختی سے تردید کی ہے۔ [۲۶] راقم کا خیال ہے اصولی طور پر تو جمال پانی پتی کا نقطہ نظر درست ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لا اور سات رنگ والے مضامین کے درمیانی عرصے میں عسکری کے قلم سے نہ صرف محولہ بالا بلکہ ''عوامی تھیٹر'' (اپریل ۱۹۵۹ء) اور ''شاکر علی'' (۱۹۶۰ء) جیسے مضامین بھی نکل چکے تھے ۔ بلکہ ماہ نامہ نصرت میں حنیف رامے کے قلم سے ان کی ایک گفتگو بھی آچکی تھی۔علاوہ ازیں ''روداد'' بھی قیاساً ۱۹۶۰ء کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ''مارشل لاء کا قلم چھین لینے والا'' جملہ تو صورت واقعہ کا ذرا مبالغہ آمیز بیان معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء کے بعد سے ان کے لکھنے کی رفتار میں ہر سال جو کمی آتی جارہی تھی تو یہ رجحان اب بھی زوروں پر تھا۔ ۱۹۵۹ء- ۱۹۵۸ء میں انہوں نے جو چودہ پندرہ مضامین لکھے ان میں کم و بیش آٹھ مارشل لاء سے قبل کے ہیں۔ پھر جو لکھا بھی اس کا تعلق '' باطنی دنیا'' سے زیادہ رہا ہے ''جس میں اظہار پر کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی'' بلکہ بعد میں بھی تادم مرگ عسکری کے قلم سے کسی ملکی یا سیاسی مسئلے پر کوئی تحریر نہیں نکلی سوائے '' پاکستانی قوم اور جہاد'' (۱۹۶۵ء) نامی ایک مضمون کے جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے تھا۔

عسکری کی تحریروں میں دین، مذہب ، اسلام ، اخلاقیات، اور تصور انسان کے مباحث کو اگر تاریخی ترتیب سے دیکھا جائے تو ایک مسلسل تلاش،جستجو اور تبدیلی کا عمل نظر آتا ہے ۔۱۹۵۸ء کے مارشل لا کا اس میں صرف اتنا دخل ہوسکتا ہے کہ جو تفتیشی عمل عسکری کے اندر ایک روحانی کشمکش اور باطنی نمو کے طور پر پہلے سے جاری تھا اس '' پابندی اظہار'' نے ایک ٹھہراؤ پیدا کر کے اس کے پکنے اور پختہ ہونے کے لئے عمل انگیز کا کام کیا ہو ۔ایوب خان کے مارشل لا کے ساتھ ہی ادیبوں کی ایک تنظیم رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا جس کی طرف عسکری کا ردعمل اپنے ہی انداز کا تھا ۔ یہاں بھی وہ اپنی مخصوص بے نیازی کیساتھ سب سے الگ نظر آئے ۔۔ قدرت اللہ شہاب نے تو رائٹرز گلڈ کو بے نوا اور کسمپرس ادیبوں کو بھی بااقتدار اور مراعات یافتہ طبقوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا

کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے، جس کا مقصد ایک طرف ان کے لئے فلاح و بہبود کے راستے کھولنا تھااور دوسری طرف ادب اور ادیب کی آزادی کوسنسر شپ کی کسی ممکنہ مارشل لائی ضابطے سے بچانے کے لئے خودحفاظتی کی موثر ڈھال مہیا کرنا بھی تھا، تاکہ'' اگر حکومت کسی وقت واقعی علم و ادب کے شعبوں میں فلاح و بہبود کے کسی منصوبے کا ڈول ڈالے تو ادیبوں کی ایک اجتماعی تنظیم اس کی وصول یابی اور پیش رفت کے لئے پہلے ہی سے عالم وجود میں موجود ہو''۔لیکن عمومی طور پر اسے، شمیم احمد کے الفاظ میں، ادیبوں کو پھانسنے کا ایک پھندا سمجھا گیا جو ایوب خان نے قدرت اللہ شہاب کے ذریعے بنوایا تھا۔ [۲۷] ۳۱ - ۲۹ جنوری ۱۹۵۹ء کوکراچی میں کل پاکستان رائٹرز کنونشن منعقد ہوا ،جس کے لئے ملک کے طول وعرض سے ادیبوں کو دعوت نامے(معہ رقم کرایہ) ارسال کر کے بلوایا گیا۔

کنونشن میں شرکت کے لئے لاہور سے ادیب ، کیا ترقی پسند اور کیا رجعت پسند، جوق در جوق کراچی روانہ ہوئے۔صرف دو آدمیوں نے اس میں بانگ دہل شرکت سے انکار کیا۔ لاہور سے مولانا صلاح الدین احمد اور کراچی سے محمد حسن عسکری نے۔عسکری کے لاہور کے دوست ناصر کاظمی ، اور انتظار حسین بھی شرکت کے لئے کراچی گئے تھے۔ انتظار حسین کہتے ہے کہ میں اور ناصر کاظمی کنونشن میں شرکت کے سلسلے میں پس وپش کررہے تھے،مگر صفدر میر نے ہمیں قائل کر کے چھوڑا۔آگے کا قصہ انتظار حسین کی زبانی:

> '' ہمارے حساب میں بھی بالآخر اس کام میں شریک ہونا ہی نکلا۔ ٹی ہاوس سے(انتظار حسین، ناصر کاظمی اور ان کے ترقی پسند دوست) ساتھ چلے تھے۔کراچی جا کرکند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ وہاں سارے ترقی پسند اسی حساب سے آئے بیٹھے تھے ، جس حساب سے صفدر (میر)صاحب گئے تھے۔تو ان کی پرواز ان کیساتھ۔ میں کنونشن کے افتتاحی اجلاس سے نکل کرعسکری صاحب کی طرف ہولیا۔ادھر ایک نیا اختلاف پھوٹ پڑا تھا ،مگر اس کا مجھے ایک دن پہلے ہی پتا چل گیا تھا ۔ایک دن پہلے میری شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے یہاں اس بات پر بہت تلخی نظر آرہی تھی کہ کنونشن میں وہ تو شریک ہورہے ہیں مگرعسکری صاحب نے ان کا بھی منہ نہیں کیا اور کنونشن میں شریک ہونے سے صاف انکار کردیا...
>
> عسکری صاحب کب سے مجھے لکھ رہے تھے کہ ایک پھیرا کراچی کا لگاؤ۔ اب میں وہاں پہنچا تو کس رکھائی سے ملے۔ میں سمجھ تو گیا مگر چپ رہا۔ رفتہ رفتہ کھلے، بولے'' میں سمجھ رہا تھا کہ تم اور ناصر نہیں آؤ گے''۔میں نے کہا کہ شرکت سے انکار کا شرف لاہور والوں میں سے تو بس مولانا صلاح الدین احمد نے حاصل کیا۔ باقی ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب ہی یہاں ہوئے کھنچے چلے آئے ہیں،مگر آپ کی نیت کا حال تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا'' بولے'' ہاں ، وہ تمہارے ابن الحسن میرے پاس آئے تھے میں نے کہا کہ آجاؤں گا ،پولیس کو بھیج کر بلوا لینا''۔ [۲۸]

عسکری جو ایوب خان کے مارشل لا سے ویسے ہی سخت نالاں تھے، رائٹرز گلڈ کے قیام یا اس کی دیگر کارروایوں میں کیسے شریک ہوسکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں وہ ادیبوں کی ایک ایسی تنظیم کی ضرورت کے بڑی شدت سے قائل تھے جو اہم قومی مسائل پر ملک وقوم کی آواز میں آواز ملاکر اس کی امنگوں کا ساتھ دے۔ کشمیر کے مسئلے پر انہوں نے

ادیبوں کو حکومت پاکستان کے موقف کا قائل کرنے اور اسکی ہمنوائی میں دستخطوں کی مہم بھی چلوائی تھی۔ اسی طرح جب نہر سوئز کے معاملے پر امریکہ و یورپ بیک زبان ہو کر مصر اور عالم اسلام پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو عسکری نے پاکستانی ادیبوں کے ضمیر کو پکارنا شروع کر دیا تھا، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان کی نظر میں ادیب کا اصل منصب ایک محتسب اور ''نگران'' کا تھا جسے اپنی آزادانہ حیثیت پر کبھی سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے۔ مئی ۴۶ کی ''جھلکیاں'' میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات اور مفادات کے محافظ کے طور پر تو وہ قائد اعظم کے پوری طرح ہمنوا تھے اور پاکستان کو مسلمانوں کی تہذیب و کلچر کا قلعہ سمجھتے تھے، مگر وہ غیر مشروط وفادار قائد اعظم کے بھی نہ بننا چاہتے تھے۔ ۲۰ جولائی ۴۸ کے ایک خط میں انہوں نے ممتاز شیریں کو لکھا تھا کہ میں محض قومی فائدے کے لئے اپنی رائے کو چھپانے اور حقیقت کو مسخ کرنے کا قائل نہیں ہوں ۔ میں خود سے اختلاف کرنے والے کی آزادی اظہار کے حق کی حمایت کے لئے قائد اعظم تک سے لڑنے کو تیار رہوں گا:

> ''میں اس بات کو پاکستان کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں سمجھوں گا کہ پاکستانی ادیب ہر بات میں قوم یا حکومت کی حمایت کرنے لگیں یا ہر بات کو صرف قومی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھیں ۔میں تو صرف معروضیت اور سچی غیر جانبداری چاہتا ہوں اور قوم کی سچی تعمیر کا راز اسی میں سمجھتا ہوں ... اگر میں اپنے لئے کسی شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوں تو کسی ''وفادار'' کی حیثیت سے نہیں بلکہ بھگوڑے کی حیثیت سے''۔ [۲۹]

یاد رہے کہ عسکری کے یہ خیالات ۱۹۴۸ کے اس زمانے کے ہیں جب وہ پاکستانیت کے اڑ کر لگنے والے جذبے میں سرشار، ریاست اور ادیب کی وفاداری کے مسائل چھیڑ کر ایک ہنگامہ اٹھائے ہوئے تھے ۔عین اسی ہنگام جب ریاست نے ان کے مخالف ترقی پسند ادیبوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کیا تو عسکری مسلم لیگی حکومت کیخلاف اپنے مخالفوں کی صف میں بھی کھڑے ہوئے نظر آئے تھے۔ ایوب خان کے مارشل لا آتے آتے ویسے بھی پاکستان کی سرکاری پالیسی کے پلوں کے نیچے امریکی مفادات کا بہت سا پانی آ چکا تھا، اس لئے عسکری حکومتوں کی امریکہ نواز پالیسی کی وجہ سے ان کے بھی خلاف ہو چکے تھے۔

رائٹرز گلڈ پر انہوں نے شاید ہی کبھی کچھ لکھا ہو۔ اس زمانے میں وہ ان مسائل سے بہت آگے جا چکے تھے۔ ان کا عملی ردعمل تو ہم دیکھ چکے کہ ''پولیس بھیج کر بلوا لینا'' والا تھا۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ انہیں اس سے کس قسم کے خدشات رہے ہوں گے۔ ۱۹۵۶ میں انہوں نے ادیبوں کی ایک مرکزی انجمن کی ضرورت کی تجویز پر شدید ذہنی تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس طرح کی تنظیمیں ادب کے لئے نیک فال نہیں ہوتیں۔ ادیبوں کی عالمی تنظیم ''پی ای این'' کی تاریخ کی مثال سے انہوں نے بتایا کہ اس طرح کی انجمنوں کا کام بالآخر حکومتی پالیسیوں کی ہمنوائی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔[۳۰] عسکری کا اس تنظیم سے سخت اختلاف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس میں زیادہ تر ان ادیبوں کو ممبر بنایا جاتا ہے جو سرکاری افسر بھی ہوں، لہٰذا اس کی پالیسیوں پر غلبہ بھی انہی کا رہتا ہے ۔ یہ لوگ اپنی افسری کی دھونس میں یا مختلف طرح کے سیر سپاٹوں کی ترغیب کے ذریعے ادیبوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ عسکری کے ان خیالات کا اندازہ سبط حسن کے نام ان کے خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے جن میں وہ ادیبوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہمنوائی کرتے نظر آتے ہیں جو ادیب نما سرکاری افسروں کے اثر سے آزاد ہو، جس میں عام ادیب پوری

ذہنی آزادی کیساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کر سکے۔[۳۱] عسکری کے ان خطوط کو اس ذہنی پس منظر میں دیکھنا چاہیے جب وہ ۵۶۔۱۹۵۵ء کے بعد مصر و الجزائر والے مسئلے پر روس کی طرف نرم رویہ اختیار کر رہے تھے اور ترقی پسندوں سے ان کا ربط ضبط کچھ بڑھ چلا تھا۔ اب وہ حلقہ ارباب ذوق سے بھی نالاں ہو چکے تھے۔ پاکستان میں ادب اور تہذیبی سرگرمیوں کا واحد سہارا انہیں ترقی پسند حلقوں میں نظر آتا تھا۔ ان کے نزدیک ادیب کا اصل کردار کسی ہیت حاکمہ کے وفادار کے بجائے ایک باغی اور ناقد کا تھا۔ پاکستان میں وہ حتی المقدور خود یہ کردار ادا کرتے رہے تھے۔ سن ۵۰ کے بعد اگرچہ وہ بار بار قومی اور سیاسی معاملات سے لاتعلقی کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں، مگر فی الاصل وہ گوشہ گیر ہو کر کبھی نہیں بیٹھے۔ کڑھنا اور سلگنا ان کے نزدیک ادیب کا مقدر تھا۔ اس سلسلے میں وہ جیمس جوئس، ایزرا پاونڈ، ییٹس، لورکا، بودیلیر، فلوبیر او رسارتر وغیرہ کی مثالیں پیش کرتے رہتے تھے۔ پاکستان اور اسلامی دنیا میں امریکہ اور اس کے حواریوں کے عمل دخل کا موقعہ ہو، مسلم لیگ کی سرمایہ پرستی کی پالیسی ہو، نہر سوئز، الجزائر اور عرب دنیا کے مسائل ہوں، ۱۹۶۵ کی جنگ کا معاملہ ہو یا پھر ۱۹۷۰ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے لگاؤ کا موقعہ ہو، عسکری ملکی و قومی مسائل سے لاتعلق ہو کر کبھی نہیں بیٹھ سکے۔ اور یہ سب ظاہر ہے کہ رائٹرز گلڈ کا رکن بن کر ممکن نہیں تھا، جس کے کرتا دھرتا، بقول قدرت اللہ شہاب کے، جغادری ادیب ہی تھے، لیکن وہ سرکاری افسران بھی تھے جن کی وجہ سے ان کو پی ای این سے اختلاف تھا۔

عسکری کی چالیس سالہ ادبی زندگی ایک مسلسل جستجو کی داستان تھی۔ جس میں وہ کبھی کسی ذاتی یا اجتماعی مصلحت کوشی کا شکار نہیں ہوئے۔ کوئی ترغیب یا ترہیب انہیں ڈرا، بہکا نہیں سکی۔ وہ رائے تبدیل کرنے سے نہیں ڈرتے تھے، مگر کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے حواس، جبلت اور ادبی تجربات کے پیش نظر ایسا کرتے تھے۔ شمیم احمد نے، جن کی ادبی زندگی کا ایک بڑا حصہ عسکری سے اختلاف کرتے گزارا ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ حالات کے مخالف دھارے میں سفر کرنے کے عادی تھے۔[۳۲] اپنے زمانے کی مروجہ روایتوں کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی بلکہ جس رجحان کو وہ سکہ رائج الوقت بنتے دیکھتے ان کی طبیعت فوراً اس سے ابا کرنے لگتی تھی۔ ۱۹۳۰ سے قبل جب اردو میں رومانوی اسلوب کا زور تھا عسکری اس کے مقابلے میں حقیقت نگاری اور سماجی زندگی سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے قائل تھے۔ سن ۴۰ کے عشرے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اہل دانش جب صرف سیاسی سماجی اور معاشی عوامل ہی کو حقیقی موثراتِ حیات قرار دے کر انفرادی تخلیقی جوہر کو بھی انہی کا پروردہ قرار دے رہے تھے عسکری نے اجتماعی زندگی کے مقابلے میں فرد کے انفرادی باطنی تجربات کی معنویت پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ قیام پاکستان کے زمانے میں اجتماعی سیاسی و سماجی معنویت کو اہم سمجھنے والے ترقی پسندوں سے برصغیر کے کڑوڑوں مسلمانوں کے اجتماعی شعور سے بیگانگی کا سبب پوچھنے لگے۔ ۵۰ء میں ادب کے جمود، ادب کی موت، فرانسیسی ادب، پیروی مغربی کی ضرورت، امکانات اور مشکلات کے مسائل ہوں یا اتحادِ عالم اسلام کے سوال اور سرمایہ دارانہ نظام اور امریکی عزائم کے معاملات، ہر ہر موقع اور مسئلے پر ان کی راہ سب سے جدا رہی۔ سن ۵۷۔۱۹۵۶ء کے قریب جب ان کے قریبی دوستوں کو بھی یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ امریکی سرمایہ پرستانہ رجحان کی مخالفت اور ردعمل کے نتیجے میں عسکری واپس اپنی ترقی پسندی کی طرف لوٹنے لگے ہیں، تو ایک ''وقفہ ماندگی'' کے بعد انہوں نے ترقی پسندی اور پیروی مغرب کی منزل سے بھی آگے جدید تہذیب کی معنویت ہی پر سوال اٹھانا شروع کر دئے۔ اور پھر

لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے پسندیدہ فرانسیسی ادب سمیت پورے مغربی ادب ہی کو ''سڑک کا غل غپاڑہ'' قرار دے کر اپنے مشرقی و دینی سرچشموں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور آخرش اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ مغرب نے ہمیں خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن بحمد اللہ ہماری دینی روایت اس طرح محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی روایت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اس طرح ۵۹-۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۸ء میں ان کے انتقال تک عسکری کا ذہنی سفر مسلسل ادب، مذہب اور تہذیب کے بنیادی سر چشموں کی تلاش میں رہا۔ اس دوران انہی مسائل پر ان کے رابطے کچھ فرانسیسی ادیبوں اور علما سے بھی ہوگئے تھے جن کا کچھ احوال ہم نے معیار شمارہ-۱۰ میں تفصیلاً لکھا ہے۔

عسکری کی عام شہرت اردو کے ایک نقاد کی رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگ ان پر فراری، زندگی سے گزیراں اور مریض ذہنیت سے وابستہ ہونے کا الزام لگاتے تھے مگر جیسا کہ ہم نے ان کی تحریروں کے طویل حوالوں سے واضح کیا ہے کہ عسکری اپنی ادبی سفر کے روز اول ہی سے زندگی ، سیاست، معیشت ، تہذیب و ثقافت کے مسائل سے وابستہ رہے اور استعماری ہتھکنڈوں اور زر پرستی و سرمایہ داری کی مختلف شکلوں کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہے اور اپنے زمانے کی ملکی و بین الاقوامی سیاست سے کامل آگاہی کے ساتھ جیے۔ اسی بنا پر مہر افشاں فاروقی نے ان پر اپنی معرکہ الآخر کتاب *The Post colonial Mind, Urdu Culture, Islam, and Modernity in Muhammad Hasan Askri, 2012* کے تعارف میں لکھا ہے کہ وہ اردو کے پہلے نقاد تھے جنہیں اس اصطلاح کے پورے مغربی مفہوم میں ''نقاد'' کہا جاسکتا ہے اور یہ کہ انہوں نے مابعد استعماری مطالعات کا اس وقت آغاز کر دیا تھا جب مغرب میں ابھی اس اصطلاح کا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ اپنی اس گہری حسیت اور حیثیت کے باوجود ان کی روزمرہ کی سادگی کا یہ عالم تھا ۔معروف صحافی اور صاحب طرز خاکہ نگار نصراللہ خان نے عسکری کے ایک خاکے میں لکھا ہے کہ

> ''ایک مرتبہ جب پاکستان اور امریکہ میں مثالی دوستی قائم تھی تو امریکی سفارت خانے کے ایک افسر نے مجھ سے کہا: 'تم عسکری صاحب کو امریکہ کے سفر پر مائل کر دو، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ انہیں فیلو شپ پر امریکہ جانے کی دعوت دی جائے'۔ میں نے عسکری صاحب سے تذکرہ کیا، سنتے رہے اور پھر مسکرائے اور فرمایا: 'میں نے تو پیر الٰہی بخش کالونی ہی پوری طرح نہیں دیکھی ہے تو امریکہ جا کر کیا کروں گا ۔انسان پہلے اپنا ملک تو دیکھ لے''۔[۳۳]

حواشی و حوالہ جات

۱۔ عسکری سے شفیع عقیل کا انٹرویو، مشمولہ مقالاتِ محمد حسن عسکری، مرتبہ شیما مجید، ج ا، مکتبہ علم و عرفان، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰ و ۳۵۹

۲۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں (مرتبہ محمد سہل عمر) ، مکتبہ الروایت، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲

۳۔ مقالات، ج ا، ص ۷۶

۴۔ جھلکیاں ،ص ۴۹

۵۔ مکتوب بنام ڈاکٹر آفتاب احمد، مشمولہ: تخلیقی ادب ۴، ص ۳۹۳

۶۔ مکتوب بنام آفتاب، محولہ بالا ص ۳۹۶

۷۔ مکتوب بنام ڈاکٹر آفتاب احمد، محولہ بالا ص ۳۹۳

۸۔ مکتوب بنام ڈاکٹر آفتاب احمد، محولہ بالا ص ۴۱۶

۹۔ غلام عباس کا خاکہ، مشمولہ مقالاتِ محمد عسکری، ج ۱، ص ۴۳۳ پر بھی اس کا ذکر ہے؛ مگر وہاں رسالے کے بجائے ''ایک موٹی سی کتاب مرتب'' کرنے کا خیال بتایا گیا ہے، ''جس میں پورے اسلامی کلچر اور اس کی مختلف شاخوں کا جائزہ'' ہونا تھا۔

۱۰۔ مقالاتِ محمد عسکری، ج ۲، ص ۱۱۳

۱۱۔ مقالاتِ محمد عسکری، ج ۲، ص ۱۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۳۔ بنام آفتاب احمد، تخلیقی ادب ۴، ص ۴۳۸، اس اقتباس کے خط کشیدہ جملے ان خطوط کی پہلی اشاعت، در تخلیقی ادب ۴، سے حذف کر دیے گئے تھے۔ بعد میں جب یہ مکمل کتاب کی صورت (آفتاب احمد، محمد حسن عسکری: ایک مطالعہ - ذاتی خطوط کی روشنی میں) میں آئے تو چند نئے خطوط کے اضافے کے ساتھ پرانے خطوط کے بعض محذوف حصے بھی چھاپ دیے گئے تھے۔ اس اقتباس کے بعد کا حصہ بھی عسکری صاحب کی بعد کی مذہبی فکر کی ابتدائی کڑیوں کے حوالے سے بے حد اہم ہے۔

۱۴۔ بنام آفتاب، ۱۰ر مئی ۱۹۴۷، ص ۴۳۶

۱۵۔ مکتوب بنام آفتاب احمد ۸ جولائی ۱۹۴۷؛ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۹۸ میں پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے بعد کسی من چلے نے اس لطیفے کی بنیاد پر عسکری کو مسلمان اور ایٹم بم جیسے کسی تصور کا خالق بھی بنا دیا تھا۔

۱۶۔ عسکری ''تھینک یو امریکہ''، نومبر ۱۹۵۶ء، مشمولہ مقالات، ج ۲، ص ۱۰۹-۱۰۸

۱۷۔ عسکری، محمد حسن ''سویت روس میں ایک تہذیبی تجربہ''، ۱۹۵۴ء، مشمولہ مقالات، ج ۲، ص ۳۵۴

۱۸۔ عسکری، مقالات محمد حسن عسکری، ج ۲، ص ۸۱-۸۳

۱۹۔ عسکری، محمد حسن، تخلیقی عمل اور اسلوب، ص ۳۳۰-۳۲۹

۲۰۔ عسکری، تخلیقی عمل اور اسلوب، ص ۳۸۵

۲۱۔ عسکری، ''رومال کی زنجیر'' مشمولہ ستارہ یا بادبان، ص ۳۱۴

۲۲۔ عسکری، مقالات محمد حسن عسکری، ج ۱، ص ۵۵۸

۲۳۔ مکتوب بنام آفتاب احمد، مشمولہ تخلیقی ادب ۴، ص ۴۷۹

۲۴۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ، ص ۱۱، ۴۰، ۵۳

۲۵۔ آفتاب احمد، محمد حسن عسکری۔ ایک مطالعہ، ص ۵۲

۲۶۔ جمال پانی پتی، نفی سے اثبات تک، ص ۵۵

۲۷۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، ص ۷۴۹

۲۸۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۱۵۱

۲۹۔ مکتوب بنام ممتاز شیریں، ۲۰ر جولائی ۱۹۴۸ء، بحوالہ شہاب نامہ، ص ۳۳۳؛ و مکاتیب عسکری۔ کچھ ایسے ہی خیالات ستمبر ۴۸ کی جھلکیاں میں بھی ہیں، ص ۳۱۸

۳۰۔ عسکری، محمد حسن ''مشترکہ ادبی انجمن کی تجویز''، جون ۵۶ء، مشمولہ مقالات عسکری، ج ۲، ص ۳۳۸

۳۱۔ عسکری بنام سبط حسن، مطبوعہ سہ ماہی غالب، شمارہ ۱۔۲

۳۲۔ شمیم احمد، زاویہ نظر، ص ۵۳، ۲۷۲

۳۳۔ نصراللہ خان، محمد حسن عسکری، مشمولہ *کیا قافلہ جاتا ہے*